امریکی عروج ــــ شہنشاہیت یا قیادت

ہنری کسنجر*
تلخیص: عبدالحمید اعظمی

نئے ہزاریہ کے آغاز میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو جو فوقیت حاصل ہے اس کے مقابلے میں ماضی کی سلطنتوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسلحہ سازی، سرمایہ کاری، سائنسی علوم، تکنیکی مہارت، اعلیٰ تعلیم، مقبول عام ثقافت، تمام میدانوں میں امریکہ کو عالمی سطح پر بے مثال بالادستی حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے کے دوران امریکی بالادستی عالمی استحکام کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔

امریکہ نے عالمی تنازعات میں بطور ثالث اتنا اہم کردار ادا کیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں قیامِ امن کی کوششوں کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ امریکہ اپنے اس کردار کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ وہ خود اپنے طور پر ثالثی کا کردار ادا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کی مثال ہندستان اور پاکستان کے مابین کشمیر کا تنازعہ ہے جب جولائی ۱۹۹۹ء میں اس نے ثالث بننے کی پیشکش کی تھی۔

امریکہ خود کو دنیا بھر کے لیے جمہوری اداروں کا ماخذ اور ضامن تصور کرتا ہے اور دیگر ممالک میں منصفانہ انتخابات کو اپنے معیارات پر پرکھتا ہے اور اگر کوئی ملک اس کے مقرر کردہ معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس پر معاشی پابندیاں لگانے اور دیگر دباؤ ڈالنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہے۔

انجامِ کار اس وقت امریکی فوجیں دنیا بھر میں شمالی یورپ کے میدانوں سے مشرقی ایشیا کے متنازعہ علاقوں تک بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ قیامِ امن کے نام پر روپذیر ہو رہا ہے۔ بلقان میں امریکہ وہی کام کر رہا ہے جو ماضی میں آسٹرین اور عثمانی سلطنتیں کر رہی تھیں۔ جدال و قتال میں مصروف ملکوں کے درمیان جنگ بندی کے حصول کی خاطر فوجوں کا تقرر مستقل صورت اختیار کر چکا ہے۔ سرمایہ کاری کے

* Henry Kissinger, "America at the Apex: Empire or Leader?", *The National Interest*, No. 46, Summer 2001, pp. 9-17.

سب سے بڑے ادارے کی بنیاد پر اس نے عالمی اقتصادی امور کو اپنے قابو میں لے رکھا ہے۔ امریکہ سرمایہ کاروں کی جنت اور دیگر ملکوں کی برآمدات کی عظیم ترین منڈی ہے۔ امریکی مقبول ثقافت باقی دنیا کے لیے ایک معیار بن چکی ہے۔ اگرچہ گاہے گاہے یہ معیار قومیت پسند طبقوں کے لیے باعثِ اشتعال بھی بن جاتا ہے۔

نوے کی دہائی کی باقیات سے ایک تضاد نے جنم لیا ہے۔ ایک جانب امریکہ اتنا طاقت ور ہے کہ وہ اپنے نظریات اور اصولوں پر عمل درآمد کے لیے دوسروں کو کامیابی سے مجبور کر سکتا ہے۔ دوسری جانب امریکہ دنیا کے لیے جو علاج تجویز کرتا ہے وہ داخلی دباؤ یا سرد جنگ سے حاصل تجربات کا ثمر ہوتا ہے۔ اس تضاد کے نتیجے میں عالمی نظام میں تبدیلی کے دھاروں کے لیے امریکی بالادستی سنگین امکانات کی حامل ہے۔ بین الاقوامی تناظر میں امریکی قوت کے احترام اور اعتراف کا ایک عجیب وغریب امتزاج نظر آتا ہے۔ کبھی اس کے منصوبوں پر اشتعال پیدا ہوتا ہے اور کبھی اس کے طویل المدت مقاصد تذبذب اور ابہام کا باعث بن جاتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ امریکی بالادستی کو خود اس کے عوام درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ امریکی ذرائع ابلاغ اور کانگریس میں ہونے والی تقاریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی خارجہ پالیسی میں امریکیوں کی دلچسپی جتنی کم اب ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اسی لیے قیادت کا خواب دیکھنے والے سیاست دان سمجھداری سے کام لیتے ہوئے خارجہ امور پر بحث سے دامن بچاتے ہیں۔ وہ قیادت کو مقبول اور موجود جذبات کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ گزشتہ انتخابات مسلسل ایسے تیسرے انتخابات تھے جن میں خارجہ پالیسی پر سنجیدگی سے بحث نہیں کی گئی۔

قوت اور حاکمیت کے منتہائے کمال پر پہنچ کر امریکہ عجیب مخمصے کا شکار نظر آتا ہے۔ وسیع وعمیق عالمی انتشار کے ماحول میں وہ ایسے تصورات تشکیل دینے میں ناکام ہو گیا ہے جو ظہور پذیر حقائق سے مطابقت رکھتے ہوں۔ سرد جنگ میں کامیابی نے خود پسندی کو فروغ دیا ہے۔ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے احساس کے تحت ایسی پالیسی اپنائی گئی ہے جو مانوس امور کو مستقبل کے منصوبے میں منعکس کرتی ہے۔ حیرت انگیز اقتصادی کارکردگی کی وجہ سے پالیسی ساز عموماً ہر معاملے کو معاشیات سے خلط ملط کر دیتے ہیں اور امریکی تکنیکی انقلاب کے سیاسی، ثقافتی اور روحانی اثرات کا احساس تک نہیں رکھتے۔

سرد جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی خود اطمینانی اور خوش حالی کے سبب امریکی مستقبل کے بارے میں دو قسم کے نظریات پیدا ہوئے ہیں۔ بائیں جانب والوں کے خیال میں امریکہ دنیا بھر میں مقامی مناقشات کے لیے حتمی ثالث کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور دیگر معاشروں کے مختلف ثقافتی، تاریخی پس منظر سے قطع نظر ہر قسم کی خرابیوں کا جمہوری علاج امریکہ کے پاس موجود ہے۔ اس مکتب فکر کے نزدیک خارجہ پالیسی دراصل معاشرتی پالیسی ہی کے مساوی ہے۔ وہ سرد جنگ میں کامیابی کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کر دیتے ہیں کہ تاریخی عوامل اور بڑھتے ہوئے جمہوری رجحان کے سبب جلد یا بدیر اشتراکی نظام خود بخود ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

دوسری جانب یہ خیال جاگزیں ہے کہ سوویت یونین نصف صدی کے دوران دونوں جماعتوں کی امریکی حکومتوں کی جان توڑ جدوجہد کے ذریعے نہیں بلکہ امریکہ کے پرزور لہجے اور پروثوق جذبے کے سبب (جب اس نے روس کو بُری سلطنت (The Evil Empire) قرار دیا تھا) کم وبیش خود بخود منتشر ہو گیا ہے۔ تاریخ کی اس تعبیر کی بنیاد پر ان کا خیال ہے کہ دنیا کی تمام خرابیوں کا مداوا امریکہ کی بالادستی تسلیم کرنے ہی میں پوشیدہ ہے۔

تاریخ کے دونوں نظریات کے تحت تغیر پذیر دنیا کے لیے کسی طویل المدت حل کا حصول مشکل نظر آتا ہے۔ خارجہ پالیسی کے جو مباحث سامنے آئے ہیں، ان میں دو پہلو صاف نظر آتے ہیں، اول مقصد کی صداقت اور دوم قوت کا ارتکاز، جو دوسروں کو ان پر عمل درآمد کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس ضمن میں بحث عموماً اس بات پر ہوتی ہے کہ خارجہ پالیسی کی تشکیل کے وقت اقدار کو پیش نظر رکھا جائے یا مفادات کو، نظریات کو بنیاد بنایا جائے یا حقائق کو۔ اصل مشکل ان دونوں کا امتزاج ہے۔ جب بھی خارجہ پالیسی سنجیدگی سے مرتب کی جائے گی اس میں اس استثنائیت کا پورا لحاظ رکھا جائے گا جو امریکی جمہوریت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماحول سے نگاہ چرانا بھی ممکن نہیں۔

تغیر پذیر بین الاقوامی ماحول

جو امریکی موجودہ حالات کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لیے سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ

حالیہ تبدیلیاں کسی فائدہ مند ''سٹیٹس کو'' میں عارضی تعطل کی وجہ سے رونما نہیں ہو رہی ہیں بلکہ ان سے عالمی نظام میں ناگزیر تبدیلی کا اشارہ ملتا ہے۔ یہ تبدیلیاں [اس عالمی نظام کے] کئی کلیدی شرکاء کے داخلی ڈھانچے میں بھی رونما ہو رہی ہیں اور سیاست میں جمہوریت کا چلن، اقتصادیات کی عالمگیریت (globalization) اور ذرائع ابلاغ کی برق رفتاری بھی اس کے اہم عوامل ہیں۔ ریاست کی شناخت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہاں عدل وانصاف کسی نہ کسی صورت میں نافذ ہوتا ہے۔ وہاں ایسی حکومت قائم ہوتی ہے جو اپنے شہریوں کو خارجی خطرات اور داخلی لاقانونیت سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔ جب یہ عناصر ایک ساتھ انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں تو ملک بدامنی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح مروج ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قومی ریاست کا اپنے مخصوص نظام پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ تاہم یورپ میں یہ تصور اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ظہور پذیر ہوا۔ اور اسے یورپی استعماریت نے تمام دنیا میں رواج دیا۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں ذمہ داریاں ذاتی اور روائتی ہوتی تھیں۔ جن کی بنیاد نہ تو مشترک زبان تھی اور نہ ہی یکساں ثقافت۔ وہاں حکمرانوں اور رعایا کے درمیان انتظامیہ (bureaucracy) کی رکاوٹ نہیں تھی۔ حکومتیں دستور کی نہیں بلکہ رسم ورواج اور عالمگیر کیتھولک مذہب کے احکام کی پابند تھیں۔ مذہب کی حیثیت خودمختار ادارے کی تھی۔ اسی نے صدیوں بعد (غیر ارادی طور پر) کثرتیت اور جمہوریت کی بنیاد ڈالی جس نے ریاستی طاقت کو کنٹرول کیا۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں اصلاح کلیسا تحریک (Reformation) نے اس (کلیسائی) نظام اور مذہبی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ چھاپہ خانوں کی ایجاد کے طفیل مذہبی اختلافات کی تشہیر ہوئی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ مذہبی کڑپن کی آڑ میں تیس سالہ جنگ شروع ہوگئی جس میں وسطی یورپ کی تیس فیصد آبادی کام آ گئی۔

اسی تباہی کے ملبے سے ۱۶۸۴ء کے ویسٹ فالیا (Treaty of Westphalia) کے معاہدے میں شامل اصولوں کے تحت نئے ریاستی [جمہوری] نظام کی بنیاد پڑی جس کے اساسی اصول آج بھی بین الاقوامی تعلقات کی صورت گری کر رہے ہیں۔ اس معاہدہ کی بنیاد ریاستوں کی داخلی خودمختاری ہے جس

میں کوئی دوسری ریاست مداخلت کا حق نہیں رکھتی۔

یہ اصول اس یقین کی نشان دہی کر رہے تھے کہ لوگوں کے عقائد تبدیل کرنے پر مصر غیر ملکی فوجوں کے مقابلے میں مقامی حکمران کہیں کم مطلق العنان ہوں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ توازن طاقت کے تصور کا مقصد یہ تھا کہ کسی ملک کو دوسرے ملک پر بالادستی حاصل نہ ہو اور اگر جنگ چھڑے بھی تو وہ کسی خاص علاقے تک ہی محدود رہے۔ جنگ عظیم اول کے آغاز سے قبل دو صدیوں تک تیس سالہ جنگ کے نتیجے میں قائم ہونے والی ریاستیں اس معاہدے کے مقاصد سے مستفید ہوتی رہیں (اس دوران نپولین کے دور میں دو عشروں تک مداخلت نہ کرنے کا اصول پس پشت ڈال دیا گیا تھا)۔ آج یہ تصورات [پھر] معرض خطر میں ہیں اور یہ بھلا دیا گیا ہے کہ اس معاہدے کا مقصد ہی یہ تھا کہ طاقت کا استعمال محدود رہے پھیلنے نہ پائے۔

موجودہ زمانہ میں یہ ویسٹ فالیا نظام بحران کی زد میں ہے۔ اس میں بیان کردہ اصولوں کی افادیت کو متنازعہ بنایا جا رہا ہے لیکن اس کا کوئی بدل پیش نہیں کیا جا رہا۔ دوسرے ممالک کے اندرونی امور میں عدم مداخلت کے اصول سے نہ صرف امریکہ بلکہ مغربی یورپ کے متعدد ممالک عالمگیر انسان دوستی یا قانونی حق کے نام پر انحراف کر رہے ہیں۔ ستمبر ۲۰۰۰ء میں اقوام متحدہ کے نیویارک میں منعقدہ ملینیم اجلاس میں بیشتر ممالک نے اس اصول پر مہر تصدیق ثبت کی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکہ نے انسان دوستی کے نام پر صومالیہ، ہیٹی، بوسنیا اور کوسووا میں فوجی کارروائیاں کیں۔ مزید براں مشرقی تیمور میں آسٹریا اور سیرالیون میں برطانیہ نے بھی اس طریق کار کو اپنایا۔ کوسووا کے سوا تمام کارروائیوں کو اقوام متحدہ کی حمایت حاصل تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ ''قومی ریاست'' کا قدیم اور خوابیدہ تصور تغیرات سے دوچار ہے۔ مروجہ تصور کے تحت ہر ریاست خود کو ایک قوم بھی کہتی ہے لیکن تمام ریاستیں انیسویں صدی کے ''قوم'' کے تصور پر پوری نہیں اترتیں جس کے لیے زبان، اور ثقافت کی وحدت ضروری ہے۔ رواں ہزاریہ میں بڑی طاقتوں میں سے صرف مغربی یورپ کے جمہوری ممالک اور جاپان ہی اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ چین اور روس میں قومیت اور ثقافت کا ایسا امتزاج موجود ہے جس میں متعدد نسلی امتیازات جھلکتے ہیں۔ امریکہ بھی

اپنی قومی شناخت کو اپنی کثیر نسلی حیثیت کے مساوی قرار دیتا ہے۔ دنیا کے باقی ممالک میں نسلی امتیازات کی موجودگی عام ہے اور کئی ریاستوں میں چھوٹے چھوٹے نسلی گروہ اپنی آزادی اور خود مختاری کے لیے سر اٹھاتے رہتے ہیں، جس سے ان ریاستوں کی سالمیت کو خطرات لاحق رہتے ہیں۔ خود یورپ میں بھی شرح پیدائش میں کمی اور باہر سے آنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سبب نسلی امتیاز کا مسئلہ سر اٹھا رہا ہے۔

قدیم قومی ریاستیں اس احساس کے تحت خود کو ایک عظیم تر وحدت میں شامل کر رہی ہیں کہ ان کا رقبہ عالمی سطح پر کوئی اہم کردار ادا کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یورپی یونین کی تشکیل ہے۔ مغربی نصف کرّے میں بھی اس طرح کے ادارے وجود میں آ رہے ہیں مثلاً نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ (NAFTA) اور جنوبی امریکہ میں MERCOSUR، جنوب مشرقی ایشیا میں آسیان (ASEAN)۔ چین اور جاپان کی مشترکہ کوششوں سے آزاد تجارت کے ایک ادارے کے خدوخال بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔

یہ نئے ادارے لاشعوری طور پر یا ارادتاً اپنے اپنے علاقے کی غالب قوتوں کے مقابلے میں اپنی شناخت واضح کرنے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ آسیان (ASEAN) خود کو چین اور جاپان (اور غالباً اکثر ہندستان) کا مدمقابل سمجھتے ہیں۔ یورپی یونین اور MERCOSUR امریکہ کو اپنا حریف شمار کرتے ہیں۔ اس طرح سابقہ رقابتوں کی جگہ نئی رقابتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

ماضی میں کمتر درجے کے تغیرات بعض اوقات بڑی بڑی جنگوں کی بنیاد بن جاتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ بین الاقوامی نظام میں بھی جنگیں بار بار وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں، لیکن بڑی قوتیں آپس میں دست و گریبان نہیں ہوئی ہیں کیونکہ نیوکلیائی دور نے قوت کی اہمیت اور کارکردگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ نیوکلیائی دور کے آغاز سے قبل جنگیں علاقے یا اس کے ذرائع پر قابض ہونے کے لیے لڑی جاتی تھیں تاکہ ان کی قوت اور اثر و رسوخ میں نمایاں اضافہ ہو۔ موجودہ دور میں کسی ملک کی طاقت کا معیار ملک کا رقبہ نہیں رہا بلکہ اب اس کا دارومدار ٹکنالوجی کی ترقی پر ہے۔ وسائل کے فقدان کے باوجود سنگاپور میں فی کس اوسط آمدنی بڑے بڑے ملکوں سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہاں باشندے اور قائدین ذہانت و ذکاوت میں بہت آگے ہیں۔ حریص ہمسایہ ملکوں کی حوصلہ شکنی کے لیے وہ اپنی دولت کو مقامی عسکری قوت کی تشکیل پر صرف

کرتا ہے۔اس ضمن میں دوسری مثال اسرائیل کی ہے۔

ایٹمی اسلحہ اس صلاحیت کے حامل ملکوں کے درمیان جنگ کے امکانات کو بہت کمزور کر دیتا ہے۔ تاہم میری یہ رائے تادیر درست نہیں رہے گی کیونکہ ایسے ممالک میں بھی ایٹمی اسلحے کا اضافہ ہو رہا ہے جو زندگی کا جداگانہ تصور رکھتے ہیں یا ایٹمی اسلحہ کی تباہ کاریوں کے پورے احساس سے عاری ہیں۔

نیوکلیائی دور سے قبل ممالک اس لیے جنگ کا سہارا لیتے تھے کہ ان کے خیال میں شکست یا مفاہمت کی تباہ کاری جنگ کی تباہ کاری سے بہت زیادہ ہوگی۔اسی دلیل کی بنا پر یورپ نے پہلی جنگ عظیم میں اپنے تمام وسائل خرچ کر ڈالے۔لیکن ایٹمی طاقتیں نہایت ہی سنگین حالات میں ایسا اقدام سوچ سکتی ہیں۔ان ممالک کے سربراہوں کی نظر میں ایٹمی اسلحے کی تباہ کاری سے کہیں کم مفاہمت بلکہ شکست کی تباہ کاری ہوگی۔ایٹمی دور کی یہ عجیب وغریب صورت حال ہے کہ ملکوں نے ایٹمی صلاحیت تو حاصل کر لی ہے لیکن اس کے استعمال میں وہ بہت زیادہ محتاط ہیں۔

قوت کی دیگر شکلوں میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک طاقت کے عناصر نسبتاً یکساں تھے۔معاشی، عسکری یا سیاسی عوامل ایک دوسرے کی تکمیل اور تقویت کا باعث تھے۔عسکری طور پر مستحکم ہونے کے لیے ضروری تھا کہ ملک دوسرے شعبوں میں بھی مضبوط ہو۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ عوامل ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے۔اچانک یہ حقیقت سامنے آئی کہ ملک معاشی طور پر مستحکم ہو گیا مگر دفاعی لحاظ سے کمزور ہی رہا (مثلاً سعودی عرب) یا دفاعی لحاظ سے اہم قوت بنا لیکن اقتصادی حالت پتلی ہی رہی (مثلاً سابق سوویت یونین)۔

اکیسویں صدی میں یہ شیرازہ پھر یکجا ہونے والا ہے۔روس پر جو گزری اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف عسکری قوت پر زور دے کر اسے تادیر قائم نہیں رکھا جا سکتا ہے۔یہ اقتصادی اور ٹکنالوجی کے انقلاب کا دور ہے اور ذرائع ابلاغ بڑے ہی تیز رفتار ہیں جس کی وجہ سے معیارات زندگی میں اختلافات گھر گھر پہنچ جاتے ہیں۔علاوہ بریں ہماری ایک ہی نسل نے سائنس کی ایسی زبردست پیش رفت دیکھی ہے جو ماضی کی مجموعی ترقی سے کہیں زیادہ ہے۔کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور بائیوٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی نے ٹیکنالوجی کے ایسے امکانات پیدا کر دیے ہیں جو ہمارے اسلاف کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھے۔کسی ملک کے

طویل مدت تک طاقت ور رہنے کے لیے ٹکنالوجی کی تعلیم وقت کی اہم ضرورت بن چکی ہے جو معاشرے کے اعصاب کی توانائی کے لیے نہایت اہم ہے۔

عالمگیریت کے سبب اقتصادی اور تکنیکی قوت دنیا بھر میں بکھر چکی ہے۔ ابلاغ کے فوری ذرائع کے ذریعے ایک علاقے میں کیے جانے والے فیصلوں نے دنیا کے دیگر علاقوں کو بھی یرغمال بنا لیا ہے۔ عالمگیریت نے بے مثال خوشحالی پیدا کی۔ بہرحال جو مساوی نہیں ہے۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ اس عمل سے زوال کے عوامل کی رفتار بھی عالمی خوشحالی ہی کی طرح تیز رفتار ہے یا نہیں اس سے عالمگیر تباہی کا امکان بھی پیدا ہوتا ہے۔ عالمگیریت میں یہ امکان بھی ہے کہ لاکھوں افراد کی زندگیوں کو متاثر کرنے والے فیصلے مقامی سیاسی قوتوں کے ہاتھ میں آ جائیں، اقتصادی اور تکنیکی شعبوں میں نفاست و نزاکت نے ہم عصر سیاست کی صلاحیتوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

امریکی چیلنج

امریکہ کا اپنا تاریخی تجربہ بہت محدود ہے۔ دو سمندروں کے درمیان واقع ہونے کے سبب وہ طاقت کے توازن کے تصور سے ناآشنا ہے۔ اس کا یہ یقین ہے کہ یا تو وہ دوسری قوموں کی باہمی کشمکش سے بالکل ہی الگ تھلگ رہ سکتا ہے یا وہ دنیا پر اپنی جمہوری اقدار اور خودمختاری کے معیار کے نفاذ کے ذریعے عالمگیر امن قائم کر سکتا ہے۔

امریکہ ایسی پیچیدہ دنیا میں الجھا ہوا ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اور جہاں چار بین الاقوامی نظام پہلو بہ پہلو کام کر رہے ہیں:

- امریکہ اور مغربی یورپ اور خود مغربی نصف کرے کے ممالک کے درمیان تعلقات کے لیے امریکہ کے تاریخی نظریات نہایت موزوں ہیں۔ یہاں مثالی امن کا تصور بہت موزوں ہے جو جمہوری اور اقتصادی پیش رفت کے اصول پر مبنی ہے۔ ریاستیں جمہوری ہیں، مالیات منڈی سے آشنا ہو چکی ہیں، جنگ ناقابل تصور بن چکی ہے، صرف نسلی کشمکش سر ابھار سکتی ہے۔ تنازعات جنگ یا جنگ کی دھمکی سے طے نہیں کیے جاتے۔ علاقے سے باہر کے ممالک کی دھمکیوں کے پیش نظر عسکری تیاریاں کی جاتی ہیں، بحرالکاہل اور

مغربی یورپ کے ممالک ایک دوسرے کو آنکھیں نہیں دکھاتے۔

● ایشیا کی بڑی طاقتیں جو انیسویں صدی کی یورپی ریاستوں سے رقبے اور آبادی میں کہیں زیادہ بڑی ہیں، وہ ایک دوسرے کو اپنا تزویراتی حریف (strategic rivals) تصور کرتی ہیں۔ بھارت، چین، جاپان اور روس ـــــ کوریا اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں ہیں ـــــ یہی سمجھتے ہیں کہ دیگر ممالک تنہا یا متحد ہو کر ان کی قومی سالمیت کے لیے باعث خطر ہو سکتے ہیں۔ ان کے درمیان جنگ اتنی ناگزیر بھی نہیں ہے مگر اس کے امکانات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایشیائی ملکوں کے دفاعی اخراجات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، جن کا مقصد دوسرے ایشیائی ملکوں سے تحفظ ہے۔ (تاہم چین کے چند عسکری اقدامات تائیوان کے مسئلے پر امریکہ کے ساتھ جنگ کے امکانات کی بنیاد پر ہیں)۔ انیسویں صدی کے یورپ کی طرح امن و امان کا طویل دور ممکن ہے ـــــ بلکہ متوقع بھی ہے ـــــ لیکن قوت کے توازن کے ذریعے ہی اسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔

● مشرق وسطیٰ کے تنازعات سترہویں صدی کے یورپ کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں مخاصمت کی جڑیں نہ تو بحرالکاہل خطے اور مغربی گڑے کی طرح اقتصادی ہیں، نہ ہی ایشیاء کی طرح تزویراتی بلکہ وہ نظریاتی اور مذہبی ہے۔ مفاہمت ممکن نہیں ہے کیونکہ تنازعہ کسی خاص شکایت سے متعلق نہیں، بلکہ دوسرے ملک کا وجود ہی وجہ مخاصمت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تنازعات کے حل کے لیے جو بھی کوششیں کی جاتی ہیں ان سے الٹا نقصان ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ صدر کلنٹن اور ایہود بارک کو ۲۰۰۰ء کے موسم گرما میں کیمپ ڈیوڈ کے سمجھوتے کے بعد تجربہ ہوا۔ مقدس مقام پر مفاہمت کے سوال پر انہیں احساس ہو گیا کہ فریقین کے موقف میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

● افریقہ ایک ایسا براعظم ہے جہاں کے لیے یورپ کی تاریخ میں کوئی مثال دستیاب نہیں ہے۔ وہاں ۴۶ قومیں ہیں جو جمہوریت کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن وہ اپنی پالیسی کو کسی متحدہ نظریاتی بنیاد پر استوار نہیں کرتیں اور نہ ہی وہ توازن طاقت کے اصول کو یاد رکھتی ہیں۔ براعظم بہت بڑا ہے اور اس کی اکثر ریاستوں کی پہنچ اتنی نہیں کہ وہ افریقہ میں کسی توازن طاقت کی بات کر سکیں۔ علاوہ بریں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد افریقہ پر بڑی قوتوں کی رقابتیں بڑی حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ وہاں استعمار کی روایات نے انہیں تشدد پسند بنا دیا

ہے۔ نسلی مناقشات، سنگین پسماندگی، صحت کے خطرناک مسائل عام ہیں۔ استعماری قوتوں نے اپنی سہولت کے لیے جو سرحدیں مقرر کی تھیں اس سے قبائل اور نسلی گروہ تقسیم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مختلف نسلوں اور مذہبی گروہوں کو انتظامی وحدت میں جمع کر لیا، جو بعد میں آزاد ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ اسی لیے افریقہ میں ہولناک خانہ جنگیاں رونما ہوئیں جنہوں نے پھیل کر بین الاقوامی جنگ کی صورت اختیار کر لی اور ایسے امراض پیدا ہوئے جو انسانی ضمیر پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ اس براعظم میں جمہوریتیں اپنی تاریخی غلطیوں کا ازالہ اسی صورت میں کر سکتی ہیں کہ افریقہ کو عالمی ترقی میں حصہ دار بنانے کے قابل بنانے کا کوئی راستہ نکالیں۔ بین الاقوامی برادری کا فرض ہے کہ وہ افریقہ میں سیاسی اور نسلی اختلافات کے بعد تنازعات کو اگر بالکل ختم نہیں تو کم سے کم کرنے کے لیے کوششیں کریں۔

بین الاقوامی نظاموں کا تنوع اور دائرہ عمل ایسا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات پر امریکی مباحث حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اقدار، طاقت، نظریات یا غایتِ وجود، خارجہ پالیسی کی تشکیل کے تمام کلیدی اجزا کا انحصار اس تاریخی صورتِ حال پر ہوتا ہے کہ جس میں ایک بین الاقوامی نظام گھر ہوتا ہے۔ امریکی خارجہ پالیسی کو ہمہ وقت ایک طلسماتی فارمولے کی تلاش رہتی ہے جو ہر موقع پر کام آئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پیدا ہونے والی نظریاتی نزاکتیں اور طویل المدت لائحہ عمل امریکہ کے لیے ایک عقدۂ لاینحل بن جاتا ہے۔

شومئی قسمت سے داخلی سیاست امریکہ کی خارجہ پالیسی کو مخالف سمت میں لے جا رہی ہے۔ کانگریس نہ صرف خارجہ پالیسی کے داؤ پیچ متعین کرتی ہے بلکہ دوسری قوموں پر پابندیوں کے ذریعے ان پر ایک ضابطہ کار (code of conduct) کے نفاذ کی کوشش بھی کرتی ہے۔ فی زمانہ درجنوں ممالک ان پابندیوں کا شکار ہیں۔ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں اس صورت حال پر راضی رہی ہیں، کچھ تو اپنے دیگر منصوبوں کی منظوری کے لیے اور اس لیے بھی کہ ملک کو کسی بیرونی خطرے کا اندیشہ نہیں ہے۔ چنانچہ سیاسی کامیابی اور بقا کے لیے داخلی سیاست خارجہ پالیسی سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ امریکی خارجہ پالیسی کے ناقدین جسے برخود غلط تسلط کی تلاش قرار دیتے ہیں وہ اکثر و بیشتر داخلی سیاست کے پریشر

گروپس کی کوششوں کا ثمر ہوتا ہے۔ یہ گروہ کلیدی مسائل کو توجہ کا مرکز بنانے کے لیے انتخابات کے وقت حمایت کے دعوے یا مخالفت کی دھمکی سے کام لیتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کے مقاصد کو مستقبل کے لیے محفوظ بنا لیتے ہیں۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی پر ان کا مجموعی اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ عموماً یک رخی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی دھونس دھاندلی میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ذرائع ابلاغ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور زور و شور سے اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ انہوں نے خارجہ پالیسی کو اپنے تفریحی پروگراموں کا ایک حصہ بنا رکھا ہے۔ پیشہ ورانہ مسابقت کے سبب ایک وقتی بحران ان پر چھا جاتا ہے۔ اسے وہ نیکی اور بدی کی آویزش بنا کر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے مخصوص نتائج کی توقع رکھی جاتی ہیں لیکن شاذ و نادر ہی انہیں تاریخ کا اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ خلیج اور کوسووا کے بحران یا کیمپ ڈیوڈ کی سربراہی کانفرنس صبح و شام ذرائع ابلاغ کا تختہ مشق بنے رہے۔ لیکن اس کے بعد خاموشی چھا گئی، کبھی کبھی ذکر ہو جاتا ہے حالانکہ ان کے مخفی رجحانات اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات مسئلہ جتنا پرانا ہو جاتا ہے ان پر قابو پانا اتنا ہی دشوار ہوتا ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایسی دنیا کے لیے جس میں امریکہ کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے کوئی مربوط حکمت عملی وضع نہیں ہو سکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تین نسلیں اپنے مختلف خیالات کے تحت امریکی خارجہ پالیسی کو موضوع بحث بنائے ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں کی سرد جنگ کے سابقہ ماہرین چاہتے ہیں کہ نئے ہزار سالہ دور کے لیے ان کے تجربات سے استفادہ کیا جائے۔ ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاجی تحریک چلانے والوں کا مطالبہ ہے کہ ابھرتے ہوئے عالمی نظام کو ان سے سبق لینا چاہیے۔ تیسری قوت اس نئی نسل کی ہے جو اپنے تجربات کے آگے سرد جنگ دیکھنے والی نسل یا ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والوں کے احساسات کو لائق توجہ نہیں سمجھتی۔

سرد جنگ کے تزویراتی ماہرین چاہتے تھے کہ ایٹمی سپر طاقتوں کے تنازعات پر قابو پانے کے لیے روس کو کسی خاص حد میں رکھا جائے۔ غیر فوجی مسائل سے صرف نظر نہ کرنے کے باوجود (بہر صورت مجموعی منصوبہ بندی میں مارشل پلان بھی اتنا اہم تھا جتنا کہ نیٹو) سرد جنگ کی نسل مصر تھی کہ بین الاقوامی سیاست میں ایسی توانائی ہے جو کم نہیں کی جا سکتی ہے، جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں روس کو

سیاسی اور عسکری توسیع سے باز رکھنے کی کتنی صلاحیت ہے۔

سرد جنگ کی نسل کے تزویراتی ماہرین نے کچھ مدت کے لیے امریکی مباحث میں نظریات اور قوت کے اختلافات کو بالکل ختم نہ سہی کم ضرور کر دیا۔ ایسی دنیا میں جہاں دو سپر طاقتوں کی بالادستی ہو نظریہ اور توازن کے تصور کا اجاگر ہونا ممکن تھا۔ خارجہ پالیسی ایک ایسا کھیل بن گئی جس میں ایک فریق کا نفع دوسرے کا نقصان ہے اور نتیجہ صفر نکلتا ہے۔

سرد جنگ کے بعد کی امریکی سفارتی خارجہ پالیسی کا اصل زور اس امر پر صرف ہوا کہ روس کی توسیع پسندی کو لگام دینے کے علاوہ جرمنی اور جاپان جیسے شکست خوردہ دشمنوں کو بین الاقوامی نظام کے ایک مکمل رکن کی حیثیت سے واپس لایا جائے۔ یہ بے مثال کام ان قوموں کے لیے کیا گیا، پانچ برس قبل جن پر غیر مشروط سپر اندازی ٹھونسی گئی تھی، اسے امریکہ کی اس نسل کے قائدین نے معقول و مناسب تصور کیا جنہیں صرف ۱۹۳۰ء کی اقتصادی کساد بازاری کا تجربہ تھا۔ جس نسل نے روس کے خلاف مزاحمت کا اہتمام کیا، جس نے فرینکلن ڈی روز ویلٹ کی New Deal کا تجربہ کیا اور امریکی توقعات اور اقتصادی حقائق کے درمیان خلیج کو پر کر دیا تھا، اسی نسل نے جمہوریت کی دُہائی دے کر دوسری جنگ عظیم لڑی تھی۔

ویت نام کی جنگ نے نظریے اور حکمت عملی کے امتزاج کو توڑ دیا، جس نے اس نسل کے افکار کو تشکیل دیا تھا جسے اب ''عظیم ترین نسل'' کہا جاتا ہے۔ اگرچہ خارجہ پالیسی کی بحث میں شریک تمام داخلی فریق امریکی استثنائیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں لیکن حقیقی امور پر اس کا اطلاق اختلاف کا باعث بن جاتا ہے۔

ویت نام کے تجربات کا صدمہ اٹھانے کے بعد سرد جنگ کی پالیسیوں کے حمایتی پرانے دانش وروں نے یا تو تزویرات (strategy) کے میدان کو ترک کر دیا یا عملی طور پر امریکہ کی بعد از جنگ خارجہ پالیسی کو یکسر مسترد کر دیا۔ صدر بل کلنٹن کی انتظامیہ میں پہلی بار متعدد ایسے افراد شامل تھے جو جنگ ویت نام کے خلاف احتجاج کے رکن تھے۔ اس انتظامیہ نے سرد جنگ کو ایسی غلط فہمی قرار دیا جسے امریکی ہٹ دھرمی نے سخت پیچیدہ بنا دیا۔ انہوں نے قومی مفاد کے تصور سے اجتناب برتا اور قوت کے استعمال کو اس وقت تک غیر معتبر سمجھا جب تک اسے کسی بے غرض مقصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے جس میں کسی امریکی

مفاد کا شائبہ تک نہ ہو۔ متعدد بار اور کئی براعظموں میں صدر کلنٹن نے اپنے پیش رووں کے ایسے عمل کے بارے میں کھلے عام معذرت کی جنہیں وہ حقارت سے سرد جنگ کی ذہنی سوچ کا ثمر سمجھتے تھے۔ لیکن سرد جنگ کسی غلط پالیسی کا نتیجہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس وقت متعدد غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اس وقت مسئلہ بقا اور قومی مقصد کا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ان قوموں نے بے غرضی کے دعوے کو ایک مخصوص قسم کی عدم پیش بینی بلکہ بے اعتباری قرار دیا جو سفارت کاری کو ہمیشہ سے مفادات پر مفاہمت سمجھتے تھے۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ امریکہ کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ سرد جنگ کے زمانے کی پالیسی یا اٹھارہویں صدی کی سفارت کاری کی طرف پلٹ جائے۔ موجودہ دنیا کی پیچیدگیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے اور اسے سنبھالنے کے لیے ایسے عمل کی ضرورت ہے جسے حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیل کیا جا سکے۔ لیکن اس میں احتجاجی دور کی مطلب پرستی اور ذاتی دیانت کی گنجائش ہے۔ بہرصورت یہ تینوں مکتب فکر ایک ایسے دور کے خاتمے کی نشان دہی کرتے ہیں جس کے مباحث ۱۹۶۰ء کے بعد پیدا ہونے والی نسل کے لیے عسیر الفہم اور علمی ہیں۔

اس نسل نے ابھی تک ایسے رہنما نہیں پیدا کیے ہیں جو کسی یک رنگ اور طویل المدت خارجہ پالیسی سے جذباتی طور پر وابستہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ متعدد افراد یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کیا ہمیں کسی خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے؟ عالمگیر اقتصادی امور میں دلچسپی لینے والی دنیا میں سرد جنگ کے بعد والی نسل کی نظریں وال اسٹریٹ یا سلیکان ویلی پر بالکل اسی طرح جمی ہوئی ہیں جیسی کہ ان کے بزرگوں کی عوامی خدمت (public service) کے لیے واشنگٹن پر مرکوز رہتی تھیں۔

سرد جنگ سے بعد کی نسل کے اقتصادی معمولات خود غرضی پر مبنی ہیں لیکن اس ضمن میں وہ خود کو خطاوار تسلیم نہیں کرتی۔ (اگرچہ کبھی کبھی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے قومی بے غرضی کا بھی حوالہ دیتی ہیں)۔ یہ نسل ایسے نظامِ تعلیم کی پیداوار ہے جس میں تاریخ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور اسی وجہ سے وہ خارجہ امور کے مختلف تناظر سے ناواقف ہے۔ یہ نسل خطرات سے عاری بین الاقوامی تعلقات کے تصور کے جال میں پھنسی ہوئی ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں مسابقت کا بدل سمجھتی ہے۔ اس ماحول میں یہ یقین قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اقتصادی ذاتی منافع کے عمل کے ذریعہ آخر کار خود بہ خود عالمی سیاست میں

مفاہمت اور جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا۔

اس طرح کا انداز فکر اس لیے ممکن ہوا ہے کہ عام جنگ کا خطرہ تقریباً ٹل چکا ہے۔ اس طرح کی دنیا میں سرد جنگ کے بعد کی نسل کے امریکی راہنماؤں کے لیے یہ تصور کر لینا بعید از قیاس نہیں کہ امریکی خارجہ پالیسی کا اصل مقصد اقتصادی پالیسی کو کامیاب کرنا اور دنیا کو امریکی اوصاف کا قائل کرنا ہونا چاہیے۔

لیکن اقتصادی عالمگیریت کسی عالمی نظام کا بدل نہیں بن سکتی اگرچہ وہ اس کا ایک ضروری جزو شمار ہو سکتی ہے۔ عالمگیر اقتصادی عمل کی کامیابی سے معاشرے میں داخلی سطح پر بھی اور مختلف معاشروں کے باہمی تعلقات کے حوالے سے بھی بے ترتیبی، انتشار اور کشاکش پیدا ہوں گے جس کے اثرات اور دباؤ لازماً دنیا کی سیاسی قیادتوں پر ہوں گے۔ دریں اثناء دنیا کے مختلف خطوں میں ''قومی ریاست'' کی تشکیل دو متضاد رجحانات کے زیر اثر رو پذیر ہو رہی ہے، یعنی یا تو یہ ریاستیں نسلی امتیازات کے سبب تقسیم ہو رہی ہیں یا بڑے علاقائی گروہوں میں ضم ہو رہی ہیں۔

سرد جنگ کے بعد والی نسل جب تک روشن خیال قومی مفاد کی غیر معذرت خواہانہ تشریح کی الجھنوں میں گرفتار رہے گی اسے اخلاقی رفعت حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس کی بے دست و پائی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ یقیناً حقیقی معنوں میں امریکی بننے کے لیے ضروری ہے کہ قومی مفاد کی بنیاد جمہوری روایات اور دنیا بھر میں جمہوریت کے فروغ پر استوار ہو۔ تاہم امریکہ کو چاہیے کہ وہ چند مشکل سوالات کے حل کے لیے اپنی اقدار کو عملی صورت دے۔ مثلاً کیا ہم اپنی بقاء کے لیے تمام ذرائع استعمال کریں گے خواہ وہ کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں؟ دیانت کا تقاضا کیا ہے؟ کسی عملی اقدام کے لیے بین الاقوامی اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ وہ کتنا بھی کم کیوں نہ حاصل ہو یا اگر ضروری ہو تو ہم اکیلے ہی ہر کارروائی کر گزریں؟ وہ کون سی غلطیاں ہیں جس کی اصلاح کی ہم کوشش کریں گے؟ کون کون سے مقاصد ہیں جو ہماری استعداد اور پہنچ سے باہر ہیں؟

ہنری کسنجر سابق امریکی وزیر خارجہ اور کسنجر ایسوسی ایٹس کے

چیئرمین ہیں۔ یہ مضمون ان کی تازہ ترین کتاب "کیا امریکی کو کسی خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے؟" سے لیا گیا ہے۔ (Simon & Schuster 2001)]